ناول "تنہا" میں سیاسی صورت حال کی پیش کش

محمد خرم صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج بھاگٹانوالہ، سرگودھا
ڈاکٹر محمد الطاف یوسف زئی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ

Abstarct:
"Tanha" is a political novel which has been created in the background of Dhaka Fall.The central character of this novel is a girl student who went to East Pakistan from West Pakistan for studies.Through this protagonist the novelist Salma Awan has portrayed revealing political upheavals in East Pakistan.The first part of the novel extends acknowledgement of the Bengalies for being die hard freedom activist and highly sacrificing for this noble cause.Salma Awan has also enlightened some reservations rendered by afore said revolutionaries.

سلمیٰ اعوان کا ناول "تنہا" ۱۹۸۳ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ ناول بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا مگر مختلف اشاعتی اداروں کی معذوریوں کے باعث اسے طویل انتظار کرنا پڑا۔ مصنفہ نے اس کی اشاعت کی دل خراش داستان دیباچے میں بیان کی ہے۔ یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ جدوجہدِ آزادی اور تحریکِ آزادی میں اہلِ بنگال پیش پیش تھے۔ جس طرح پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد اور لے کے رہیں گے پاکستان، کے نعرے گونجتے تھے اُسی طرح مشرقی طرف بھی عوام کے ایسے ہی جذبات تھے۔ پاکستان دوستی اور وطن کی محبت کا واضح اظہار بنگالی عوام کے انقلابی نعروں اور طرزِ عمل سے عام ہوتا تھا۔ سانحہء ۱۹۷۱ء کی فضا پر تحریر کردہ ناول "تنہا" کا ایسے ہی جذبات سے آغاز ہوتا ہے۔ وطن کی سالمیت اور اتفاق کے جذبات سے مزین یہ ناول بلاشبہ ایک عمدہ تخلیق ہے۔

"تنہا" کا مرکزی کردار سمیعہ علی عرف سومی آپا مغربی پاکستان سے بسلسلہ تعلیم مشرقی پاکستان کا رُخ کرتی ہے۔ پھر وہاں بطور طالب علم جو کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہے اُسی صورت حال کو ناول کا روپ دیا گیا ہے۔ ایک طرح سے سومی آپا کے روپ میں خود مصنفہ یہ سب مراحل طے کرتی ہے۔ سلمیٰ اعوان خود بھی ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ سے واپس آئیں۔ ڈھاکہ کے قیام کے دوران جو داخلی اور خارجی جذبات اُن کی ذات کا حصہ بنے اُنھیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ "تنہا" میں پیش کر دیا ہے۔

ناول کے آغاز میں پاکستان سے محبت اور اُس کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے عزم کا ارادہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بنگال میں بھی ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح ہندو مسلم کی خلیج موجود تھی۔ جدوجہدِ آزادی کے

موقع پر اور پھر بعد میں بھی ہندو، ہندوستان کے حوالے سے اور مسلمان پاکستان کے حوالے سے اپنی ہمدردیاں اور وفاداریاں ظاہر کرتے رہے۔ اکثر اوقات دونوں قومیں ایک دوسرے کی ضد میں اور بھی شد و مد کے ساتھ اپنے اپنے اوطان کے حق میں نعرے لگاتیں۔ اس کا بنیادی مقصد اپنی محبت کا اپنے وطن کے لیے اظہار کرنا اور ساتھ ہی مخالف کو زِک پہچانا ہوتا تھا۔ اِسی سبب ناول "تنہا" میں جب ایک ہندو لڑکا بھارت کے حق میں نعرہ لگاتا ہے تو جواب میں شبلی اور اُس کے ساتھی پورے زور سے پکار اُٹھتے ہیں :

" پاکستان جندہ باد........"

ان کی جندہ باد کی یہ مشتر کہ آواز بہت دور تک سنائی دی گئی۔ ان کے گلوں کی ایک ایک رگ پھولی تھی اور ان کی سوکھی سڑی چمڑیوں کے نیچے سینوں کے پنجر بہت نمایاں ہو گئے تھے ان کے گندمی اور سانولے چہروں پر شوق و آرزو کی ایک دنیا امنڈی تھی۔"[۱]

نئے وطن کی آرزو اور محبت خون بن کر اِن لوگوں کے رگ وپے میں دوڑنے لگی تھی۔ پاکستان کے نام پر اِن کے جذبات مچل اُٹھتے اور مخالفت پر یہی جذبات سراپا ہنگام ہو جاتے تھے۔ پاکستان اور اپنے لیڈر قائد اعظم محمد علی جناح اِن کی زندگیوں کے محور بن چکے تھے۔ ان کی کوششیں اور شب وروز اب اسی محور کے گرد گھومتے تھے۔ وطن اور رہنما کی محبت اِن کو جنونی بنائے دیتی تھی۔ شلبی اور اُس کے ساتھیوں کی والہانہ وابستگی کو دیکھتے ہوئے مخالف ہندو لڑکوں کو بھی یہ کہنا پڑا کہ :

"ذرا دیکھو تو ان ملیچھ مسلمان چھیلوں (لڑکوں) کے کیسے پَر لگ گئے ہیں۔ پاکستان اور جناح نے سب کو پاگل بنا دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے بھارت ماتا کے ٹکڑے کون کرتا ہے۔"[۲]

پاکستان کے نام پر جناح کی قیادت میں بنگالی مسلمان واقعی پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ پاکستان اور جناح سے سچی محبت کے بے پناہ مظاہرے ظہور میں آئے۔ پاکستان اور جناح کے نام پر نوجوان بنگالی مسلمانوں کے جذبات دیدنی ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اہل بنگال نے جناح کی محبت کو شیر بنگال فضل الحق کی محبت پر فوقیت عطا کر دی۔ میمن پور کے ایک اسٹیشن جمال پور پر ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ فضل الحق جونہی اسٹیج پر آئے لوگوں نے شور مچا کر اُنھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ مگر فضل الحق کی جذباتی اپیل پر لوگوں نے پھر سے فضل الحق جندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے مگر الیکشن میں ووٹ جناح کو ہی دیئے اور فضل الحق کے اُمیدوار کی ضمانت بھی ضبط کروادی۔"[۳] یہ تو جمال پور کی بات ہوئی۔ جناح صاحب کی محبت میں تو اہل بنگال نے فضل الحق کے آبائی وطن باقر گنج میں بھی فضل الحق کو زیر کیے رکھا۔ اس سفر میں طلبہ نے جناح کے ہراول دستے کا فریضہ انجام دیا۔ مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان کے طلبہ نے بھی قائد کے پیغام اور جدوجہد پر پوری قوت اور خلوص سے لبیک کہا۔ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے پاکستان اور جناح کی محبت میں بہت سی عملی مثالیں قائم کیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت فضل الحق کے آبائی وطن باقر گنج کے طلبہ کا وہ خط بھی ہے جو اُنھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کے نام تحریر کیا۔ جس میں اُنھوں نے واشگاف انداز میں اقرار کیا کہ :

"ہم آپ کو خوش آمدید کہنے کو بے قرار ہیں آپ کی آمد کی خبر نے ہمارے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے شیر بنگال کو ہم نے اس کے اپنے ضلع میں کیسے زیر کیا ہے۔"؎۴

اہل بنگال کی پاکستان، جدوجہدِ پاکستان اور جناح صاحب سے محبت کی ان گنت مثالیں ہیں۔ اُنھوں نے پاکستان اور جناح کے نام پر ہر اُس فرد اور فیصلے سے بغاوت کی جو پاکستان یا جناح مخالف تھا۔ قیامِ پاکستان کے عمل میں ہر تحریک اور جدوجہد کا ساتھ دیا۔ اُنھیں یہ یقین تھا کہ پاکستان کے قیام سے وہ ایک جداگانہ آزاد حیثیت کے حامل ہو جائیں گے۔ جہاں اُن کی اپنی حکومت ہوگی جو فرد کی آزادی، اسلامی اقدار کی پاسداری اور عوام کے حقوق کی ضامن ہوگی۔ مگر قیام پاکستان کے بعد جب حالات اُن کی توقعات کے مطابق ظاہر نہ ہوئے تو اُن کی اُمیدیں اور یقین ٹوٹنے لگا۔ اُردو اور بنگلہ زبان کے مسئلے نے حل نہ پاکر اِس بے قراری کو مزید ہوا دی اور آخر کار مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں رستہ پاتی چلی گئیں۔ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور مغربی حصے کی زیادتیاں بنگالیوں کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوئیں۔ اس عمل کی ابتداء زبان کے مسئلے سے ہوئی جس کی طرف مناسب اعتنانہ برتا گیا۔ آزادی کے عظیم مقصد کے پیش نظر دورانِ جدوجہد اس مسئلے کو زیرِ بحث لانا غیر ضروری اور قبل از وقت سمجھا گیا مگر قیام پاکستان کے بعد جب زندگی روزمرہ کے معمول پر آنے لگی تو یہی معمولی مسئلہ مشرقی پاکستان والوں کے لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کرنے لگا۔ اس کی بنیادی وجہ وفاق کی بنگلہ زبان سے بے اعتنائی تھی۔ پورے ملک میں اُردو زبان کو سرکاری حیثیت دینے کا اعلان ہوگیا۔ اس اعلان پر "تنہا" کے کردار بھی سراپاء حیرت دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے محبوب اور عظیم رہنما کی زبانی ڈھاکا یونیورسٹی میں کیا گیا یہ اعلان سن کر اُنھوں نے احتراماً اور عقیدتاً نظریں جھکا تو لی تھیں مگر آپس میں گھروں کے اندر دبی دبی آواز میں یہ بحث ضرور چل پڑی تھی کہ:

"عظیم قائد نے یہ کیسا حکم دے دیا ہے؟ ہم تعلیمی اور سماجی طور پر پس ماندہ ضرور ہیں پر ہماری زبان وسیع علمی اثاثہ کی مالک ہے۔ اس کی موت تو بنگال کی تہذیب و ثقافت کی موت ہوگی۔"؎۵

زبان کا مسئلہ رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس حوالے سے بنگالیوں کی دو نسلوں میں اکثر بحث و مباحثہ جاری رہتا۔ یہ دو نسلیں بزرگ اور جوان تھے۔ بزرگ نسل اپنے تجربے اور عمر کے حوالے سے دنگا فساد سے اجتناب کرنے اور تعمیری کوشش پر یقین رکھتے تھے جبکہ نوجوان نسل زبان کے مسئلے پر شدت اختیار کیے ہوئے تھی اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے تعمیر کی بجائے تخریب کے رستے کو اپنانے کی بھی داعی تھی۔ اگرچہ بزرگ نوجوانوں کو سمجھاتے مگر جوان خون زبان کے مسئلہ پر جوش کھائے ہوا تھا۔ اس جوش کو ہوا دینے میں مغربی پاکستان کے افسران اور حکمرانوں کی بے اعتنائی اور جانبداری کی روش کو بھی اہم دخل تھا۔ اسی روش کے ردِ عمل میں نوجوان نسل ہر قسم کی تباہی مچانے کو بھی تیار تھی۔ اگرچہ بڑے سمجھاتے کہ شدت اور تخریب کے رویوں سے تباہی مچے گی، مگر نوجوانوں کو اِس کی پرواہ نہ تھی اور وہ بڑے دبنگ انداز میں تباہی کے متعلق کہتے کہ:

"وہ تو بچے گی۔ ڈھاکا کی ارسٹو کریسی اور حکمران کلاس کو بنگلہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ویسٹ پاکستانی اس کی جون اور ہیئت (رسم الخط) بدل دینے کی بات کریں یا اسے کھڈے لائن لگا دینے کا سوچیں، انھیں صرف اپنی کرسیوں کی فکر ہے۔ یاد رکھیں دادو! تباہی کے بغیر حصول مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔"[٦]

اجتبیٰ الرحمن عرف شبلی بنگلہ دیش کے قیام کا حامی ہے، مگر اس مقصد کے لیے وہ دیگر افراد کی طرح حد سے نہیں گزرتا بلکہ عقل و خرد کا دامن تھامے رکھتا ہے۔ وہ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہے۔ اس لیے اپنے انقلابی مقصد کو بھی مناسب ذریعے سے حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔ شبلی اور سومی کے مابین ایک لطیف محبت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ محبت اظہار کی محتاج نہیں۔ شبلی بنگلہ سماج کا نمائندہ ہے جبکہ سومی مغربی پاکستان اور متحدہ پاکستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سومی کی وطن سے محبت اور مستقل مزاجی بالآخر شبلی کی محبت پر بھی غالب آتی ہے جبکہ شبلی کی سومی سے محبت بنگلہ و محبت پر غالب آتی ہے اور وہ سومی کو خود اپنے ہی علیحدگی پسند گروہ کے اغوا کاروں سے بچاتا ہے۔ ناول میں سیاست، بنگالیوں کی ابتدائی حب الوطنی، مغربی پاکستان والوں کا امتیازی سلوک، وسائل کا استحصال اور نفرت کے جذبات کا پروان چڑھنا جیسے عوامل کے بیان سے اسے ایک تاریخی حیثیت عطا ہو گئی ہے۔

تقسیم پاکستان کا سفر، مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان خلیج سے شروع ہو کر سقوطِ ڈھاکہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین قائم ہونے والی خلیج کا بنیادی سبب مشرقی پاکستان والوں کا استحصال تھا۔ یہ استحصال مغربی پاکستان والوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ اس مسئلے اور اس طرح کے دیگر عوامل کی طرف کم و بیش ہر اُس ناول نے اظہار کیا ہے جو سانحہ ۱۹۷۱ء کے تناظر میں تخلیق ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ ""پاکستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اس کے الم انگیز تاریخی سروکار پاکستان کی سیاسی تاریخ کا انمٹ حصہ ہیں۔"[٧]

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بنگالی عوام یہ سمجھنے لگی تھی کہ اُن کی محنت اور دولت کی برکات اُن کی بجائے مغربی پاکستان پر ہو رہی ہیں۔ نیز قومی وسائل میں اُن کا حصہ دبایا جا رہا ہے۔ وسائل کی نامناسب تقسیم اور حکمرانوں کی بے اعتنائی، بنگالی عوام کے دلوں میں ایسی کدورت پیدا کر رہی تھی جو ایک ناسور کو جنم دینے کے سوا کوئی اور نتیجہ نہ نکال سکتی تھی۔ اس کی ایک مثال ناول "تنہا" سے ملاحظہ ہو۔ جب مغربی پاکستان سے آئی ایک ہمدرد طالبہ سومی آپا کو اپنے بنگالی عزیزوں سے یہ سب کچھ سُننے کو ملتا ہے:

"ارے سومی آپا! بائیس (۲۲) سالوں نے ہمیں کیا دیا؟ اقتصادی بدحالی۔ اب ذرا دیکھیے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ہماری پٹ سن نے پاکستان کو ستر فیصد زرمبادلہ دیا لیکن ہمارے صوبے پر ترقیاتی خرچ صرف پندرہ تا بیس فیصد تھا۔ انڈسٹری اور کارخانے لگانے کی حوصلہ افزائی صرف ویسٹ پاکستان میں ہوئی۔ پوربو پاکستان حکمران کی ترجیح نہیں تھا۔ پاکستان سے پہلے کلکتہ کی منڈی تھے اب ویسٹ پاکستان کی ہیں۔"[٨]

بنگال کا باشعور طبقہ زندگی کے ہر شعبے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ محض اقتصادی زیادتی ہی اُن کے پیشِ نظر تھی بلکہ ملکی سیاست اور اُس میں ہونے والی ہر طرح کی تبدیلیاں بھی اُن کی توجہ اپنی طرف جذب کیے ہوئی تھیں۔ ایسے میں ملک کا پہلا آئین ترتیب دیا جاتا ہے۔ ملک کے ایک اہم اور بڑے حصہ ہونے کے سبب پوربو پاکستان والے اِس اُمید میں تھے کہ ملک کے پہلے آئین میں اُن کے حقوق کا بھرپور تحفظ کیا جائے گا اور اُن کی سالمیت کو مقدم جانا جائے گا مگر آئین کے سامنے آنے سے بنگالی عوام کے جذبات کو ایک بار پھر ٹھیس لگی۔ اس بات کا طعنہ بھی سومی آپا کو اجتبیٰ الرحمان عرف شبلی سے کچھ یوں سننا پڑا:

"تم سیاسیات کی طالبہ ہو۔ اگر ۱۹۶۲ء کا آئین تمہاری نظروں سے گزرے تو غیر جانبدار ہو کر اس کا مطالعہ کرنا۔ یقیناً تم پر ثابت ہو گا کہ ساڑھے سات کروڑ کی اس بنگالی قوم کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تم بتاؤ! کوئی خوددار قوم اس صورتِ حال کو برداشت کرتی؟ یقیناً نہیں۔ لہٰذا ایشیا اور افریقہ کے بعض ممالک کی طرح ہم لوگ بھی مذہب کی بجائے علاقائیت کی طرف جھک گئے ہیں۔"۹

پاکستان مذہب اسلام کے نام پر بننے والی ایک ایسی مملکت تھی جسے اسلام کے سنہری اور انصاف پرور اصولوں کے تحت پروان چڑھنا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جب حکمران اور افسران اجتماعیت کی بجائے علاقائی قومیت پر دھیان دینے لگے تو اس سے علاقائی تعصب پنپنے لگا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مغربی حکمران اور افسران مشرقی پاکستان جا کر جنرل اعظم خان جیسے لوگوں کے مقلد بنتے ہوئے ہر مشکل گھڑی میں اپنے بنگالی بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہوں۔ سیلابوں میں عوام کے ہمراہ کیچڑ میں دھنس کے چلیں اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر اُن کے ساتھ دھکے کھائیں اور ہر طرح کے حالات میں اُن کا سہارا بنیں۔ مگر مشرقی پاکستان جانے والے افسران بنگالیوں کو بندگانِ ذلیل اور کالے سمجھتے ہوئے اِن سے گوروں جیسا سلوک روا رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی "تنہا" کا مرکزی کردار سومی آپا مغربی پاکستان کا مقدمہ لڑنے کی کوشش کرتا تو اُسے ہر بار کچھ اس طرح کے تلخ حقائق سننا پڑتے:

"آپ کی بیوروکریسی صرف یہاں ہم پر حکومت کرنے آتی ہے۔ نہ انھیں ہمارے مسائل سے ہمدردی ہے، نہ کوئی دلچسپی۔ نہ وہ ہماری زبان جانتے ہیں اور نہ ہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کالے صاحب ہیں جنھوں نے گورے صاحبوں کی جگہ لے لی ہے۔"۱۰

اِن تلخ حقائق کا بیان محض زیبِ داستاں کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بنگالیوں کو متنفر کرنے اور اجنبی بنانے پر اُن سول اور فوجی افسران کا بڑا عمل دخل ہے جو مغربی پاکستان میں بیٹھ کر پالیسی سازی کرتے۔ اِن کا محور مغربی پاکستان اور مرکز کو ہی نوازنا ہوتا۔ مشرقی پاکستان ان کے نزدیک ثانوی حیثیت کا حامل تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ پر لکھے گئے ناول اِس تاثر کی طرف بھی اشارے فراہم کرتے ہیں کہ ایسے سول اور فوجی افسران جو مشرقی پاکستان بھیجے جاتے وہ بنگالیوں سے رعونت اور تکبر کا برتاؤ کرتے۔ اُن کے نزدیک بنگال مغربی پاکستان کی کالونی کی طرح تھا۔ لہٰذا اُن کا طرزِ عمل وہی ہوتا جو انگلستان والوں کا ہندوستان کے ساتھ بحثیت ایک کالونی تھا۔ اسی غیر مساوی اور غیر مساواتی رویے کے خلاف بنگالی اپنی الگ شناخت کا نعرہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ایک آزادی

کے بعد اب دوسری آزادی کی جدوجہد میں جُت گئے۔ پہلے پاکستان کا مطالبہ ہوا تھا اور اب بنگلہ نیشنلزم کا پرچار ہونے جارہا تھا۔ اِس تبدیلی کی ایک بنیادی وجہ حکمرانوں اور افسروں کا بنگالیوں سے روانامناسب رویہ تھا۔ اِسی رویے کے متعلق ناول "تنہا" کا اجتبیٰ الرحمن اپنے والدین سے یوں گویا ہوتا ہے:

"ان بیوروکریٹس اور فوجی حکمران ٹولے نے ہمیں پیس کر رکھ دیا ہے۔ بنگالی نیشنلزم یونہی نہیں اُبھرا ہے، اسے اُبھارا گیا ہے۔ اگر آپ کی کھلی آنکھیں اس سنہرے دیش کو کالونی بنے نہیں دیکھ رہی ہیں تو میں انہیں کھولنے سے رہا۔" ۱۱

اِس حقیقت کا اعتراف محض اُردو ناولوں میں ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ پاکستان کے اس سیاہ دور پر تبصرے کرنے والوں اور بوجھل دل کے ساتھ تاریخ رقم کرنے والوں نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کی داستان بہت سے اسرار و رموز سے بھری ہوئی ہے۔ ان میں سے بہت سے راز ایوانوں کے تہہ خانے یا خفیہ خانوں کی زینت ہیں۔ لیکن یہ امر اب ایک کھُلا راز ہے کہ اس تباہی میں ہمارے مقتدر اور انتظامی حلقوں کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور رہا ہے۔ اگرچہ یہ ہاتھ براہِ راست تخریب کا بالکل نہیں مگر ان کا غیر سنجیدہ رویہ اور افسرانہ خُو بنگالیوں کے دلوں میں مغائرت پیدا کرنے کا مسلسل سبب بنتی رہی اِس حوالے سے ڈاکٹر صفدر محمود کا یہ بیان ایک واضح دلیل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے:

"مشرقی پاکستان میں متعین کیے جانے والے مغربی پاکستانی افسر بھی دونوں صوبوں کے درمیان دوری میں اضافے کا باعث بنے۔ مقامی آبادی سے ان کا رویہ مغائرت پر مبنی تھا اور اس امر کی غمازی کرتا تھا جیسے بنگالی ان کے ہم وطن ہونے کی بجائے کسی دوسری قوم کے باشندے ہوں۔" ۱۲

نوجوانوں اور بالخصوص طلبہ کی سیاست میں اس قدر دلچسپی اُن کی اپنی بنگالی شناخت کے لیے فعالیت کو ظاہر کرتی ہے۔ طالبات بھی اپنے بناؤ سنگھار پر توجہ صرف کرنے کی بجائے سیاست پر بات کرتی عام نظر آتیں۔ ناول "تنہا" کی سومی آپا جو مغربی پاکستان سے حصولِ تعلیم کے لیے ڈھاکہ جاتی ہے وہ بھی یہ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتی کہ " کالجوں اور یونیورسٹی کی لڑکیاں اپنا وقت بناؤ سنگھار پر ہرگز ضائع نہیں کرتیں۔ نہ ہی انہیں ان سے کوئی دلچسپی ہے پر سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کوئی لڑکی ایسی نظر نہیں آئے گی جس کا تعلق کسی پارٹی سے نہ ہو۔ بچے بچے میں سیاسی شعور پایا جاتا ہے۔ گو کہ شعور سارا کا سارا مغربی پاکستان کے خلاف ہی ہے۔" ۱۳

بنگالیوں کے مغربی پاکستان سے سیاسی اختلاف کے پیچھے دونوں حصوں میں سماج کا فرق ہونا بھی شامل تھا ۔ اِس اختلاف کی دو بڑی جہات تھیں۔ ایک زبان کا فرق اور دوسرا تہذیب کا فرق۔ دونوں حصوں کو ایک وحدت میں مذہب نے ڈھال رکھا تھا۔ مگر جب مذہبی رواداری اور اصول پسندی سے ایک حصے نے انحراف کرنا شروع کیا تو زبان اور تہذیب کے فرق جو قدرے دب گئے تھے، اُبھر کر سامنے آنے لگے سب سے پہلے جس فرق نے دراڑ ڈالنے کی کوشش کی وہ اُردو اور بنگلہ زبان کا اختلاف تھا۔ اُردو کے بطور قومی زبان پورے ملک میں رائج ہونے کے حوالے سے بنگالیوں کو کچھ تحفظات تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنگلہ زبان کو بھی اہمیت دی جائے۔ جبکہ بانیءپاکستان نے ڈھاکہ

یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے پورے ملک کے لئے اُردو زبان کا اعلان کیا تھا۔ مگر بنگالی تب بھی یہ چاہتے تھے کہ اُن کی زبان بنگلہ بھی قومی زبان قرار پائے۔ زبان کا مسئلہ تو قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں "ناول تنہا" کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

> "یہ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کی ہلکی ہلکی خنکی والی ایک سہ پہر تھی۔ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کا مسئلہ سنگین تر ہو گیا تھا۔ صوبائی حکومت صورت حال پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور اس سہ پہر جب لاکھوں انسانوں کا اجتماع ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا، پولیس نے گولی چلا دی۔"۱۴

پولیس نے یہ گولی اُس اٹھارہ سالہ نوجوان پر چلائی تھی جو اِس ہجوم کی قیادت کر رہا تھا۔ اُس نے جب "بنگلہ آمار بھاشا" (بنگلہ ہماری زبان) کا فلک شگاف نعرہ لگایا تو پولیس کی گولی اُس کی ٹانگ چیر گئی۔ بنگالیوں کو اپنی دیگر تہذیبی اقدار کی طرح زبان سے بھی پیار تھا۔ یہ اسی پیار کا ہی نتیجہ تھا کہ جب اُردو کو بنگلہ پر اس قدر فوقیت دی گئی کہ ہر طرف صرف اُردو زبان ہو اور پورا ملک بشمول بنگلہ زبان بولنے والے علاقوں کو بھی اِسے اپنانے کو کہا گیا تو ردِ عمل کے طور پر مشرقی حصے میں اُردو سے کھچاؤ اور بنگلہ سے لگاؤ اور بھی بڑھ گیا۔ اس مسئلے نے دلوں میں خلیج کو اور گہرا کرنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عام لوگ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ابھی تک مغربی پاکستان والوں نے ہمیں دل سے قبول ہی نہیں کیا۔

سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں تحریر کردہ سلمیٰ اعوان کے ناول "تنہا" کو تقسیم پاکستان کی مختصر تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جس طرح تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ناول "آنگن" جدوجہد آزادی کے موضوع پر اپنی مثال آپ ہے۔ اُسی طرح مشرقی پاکستان میں شروع ہونے والی علیحدگی کی جدوجہد اور سانحہ ۱۹۷۱ء کے تناظر میں لکھے جانے والے مختلف ناولوں میں "تنہا" بھی اپنی مثال آپ ہے۔ سانحہ ۱۹۷۱ء سے قبل کی سیاسی فضا، سیاسی و سماجی اختلافات، ملک کے دونوں حصوں کے مابین خلیج اور ان سب معاملات کے بنگالیوں کی زندگی پر داخلی اثرات کو چابکدستی کے ساتھ "تنہا" میں اثر پذیر ہوتے دکھایا گیا ہے۔ سیاسی صورت حال کی اسی پیش کش کے سبب ناول ""تنہا" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ پر لکھے گئے ناولوں میں "تنہا" ایسا ناول ہے جو "آنگن" کی طرح ایک بہت بڑے سیاسی واقعے اور سیاسی فضا کو داخلی سطح پر محسوس کرتا ہے۔ اس میں سیاست خارج سے زیادہ داخل پر اثر انداز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وطن کی محبت اور افراد کی باہمی محبت سے مل کر تیار ہونے والا ناول "تنہا" سچے جذبوں کی داستان ہے۔

حواشی

۱ سلمیٰ اعوان، تنہا (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۴۴

۲ ایضاً

۳ سلمیٰ اعوان، تنہا، ص ۷۰۔۷۱

۴ سلمیٰ اعوان، تنہا، ص ۷۱

۵ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۷۶

۶ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۸۷

۷ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار(لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء)، ص۱۰۴

۸ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۱۳۲

۹ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۳۴۶

۱۰ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۱۳۲

۱۱ سلمٰی اعوان، تنہا،ص۱۱۸

۱۲ ڈاکٹر صفدر محمود،پاکستان کیوں ٹوٹا(لاہور:جنگ پبلشرز،۱۹۹۳ء)،ص۴۲

۱۳ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۲۰۵۔۲۰۶

۱۴ سلمٰی اعوان،تنہا،ص۹۷